اردو ترجمہ کاری اور حمرا خلیق

Urdu Translation and Hamra Khaleq

حافظ عبدالغنی

پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر (اُردو)، ادارہِ زبان و ادبیاتِ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر عارفہ اقبال

ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)، ادارہِ زبان و ادبیاتِ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

Abstract:

Translation is the process of converting text from one language into another. The art of translation is as ancient as human social life itself. A translator must be familiar with both languages and possess proficiency in them. In the tradition of Urdu translations, Humra Khaliq's name needs no introduction. Through her translation work, she has introduced new ideas into the language, fostering a continuous process of intellectual assimilation and acceptance. She has enriched literature with modern ideas, along with new similes and fresh metaphors, giving the language new dimensions and broader horizons.

Keywords:

Translation, Convert, Literature, Primary Language, Medieval Age, Fiction, Dimensions

کسی ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ترجمہ کہلاتا ہے۔ ترجمے کی بہترین تعریف ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> " میرے خیال میں ترجمہ ایک زبان میں پیش کردہ حقائق کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے۔ کسی تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔"(۱)

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے جسے انگریزی میں ٹرانسلیشن (Translation) کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ لاطینی سے آیا ہے۔ فن ترجمہ کاری اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ ایک سماجی گروہ کا دوسرے گروہ سے رابطہ اور تعلق قائم رکھنے کے لیے ترجمے کا سہارا لینا ضروری ہے۔ متن کو ایک زبان سے دوسری میں منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کار کو دونوں زبانوں پر عبور ہو۔ قمر رئیس کا کہنا ہے:

> "زبانوں کے درمیان فرق کو مٹانے میں ترجمہ نے جو اہم رول ادا کیا ہے، انسانی تہذیب کا ہر ورق اس کا گواہ ہے۔ انسانی علوم کو فروغ دینے میں جہاں اور بہت سے اسباب اور عوامل رہے ہیں، وہاں ترجمہ بھی ایک محرک کا رول ادا کرتا رہا ہے۔"(۲)

اختلافِ زبان کے باوجود اصل متن کا قریب ترین مفہوم اور مناسب ادائیگی ترجمے کا بنیادی مقصد ہے۔ الفاظ کا صحیح طور پر استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ترجمے کی بہ دولت ہی جدید علوم و فنون، سائنس، طب اور ٹیکنالوجی کے علاوہ بہت سے خیالات کو سمجھنے اور قوموں کو قریب لانے میں مدد ملتی ہے۔ ترجمے کی روایت سے ایک زبان دوسری زبان کے ذخیرہ الفاظ سے نہ صرف فائدہ اٹھاتی ہے بلکہ نئی اصلاحات اور اصناف کے اضافے کا سبب بھی بنتی ہے۔ یعنی کسی زبان کی ترقی میں ترجمہ کاری کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"جدید عہد میں یہ ایک ضرورت بھی ہے جس کے بغیر عالمی سطح کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ چناں چہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے گلوبل علم سے واقفیت حاصل کرنے اور جدید ٹیکنالوجی کا ساتھ دینے کے لیے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔"(۳)

ترجمہ بنیادی طور پر ان افراد کے لیے مطالعے کی سہولت مہیا کرتا ہے جو کتاب کی زبان سے آشنا نہ ہوں۔ ترجمہ کاری میں مقامی کلچر اور زمینی حقائق کا خیال رکھا جائے تو ایسا ترجمہ طبع زاد خصوصیات کا حامل ہو جاتا ہے، یوں عرق ریزی سے کیا گیا ترجمہ، متن سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ترجمہ کاری کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو دنیا کا قدیم ترین ترجمہ ہومر کی یونانی تصنیف "اوڈیسی" کا لاطینی میں ترجمہ تھا جو ۲۵۰ قبل مسیح میں کیا گیا۔ بارہویں اور تیرھویں صدی کے دوران میں ابن رشد اور بو علی سینا کی تصانیف کے لاطینی تراجم ہوئے۔ پندرہویں صدی تک تخلیق اور ترجمہ میں حد بندی قائم ہو چکی تھی۔ عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا بھر کا علمی و ادبی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق و مغرب کے علوم مختلف ادوار میں ایک دوسرے کی زبان میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔ درحقیقت زیادہ تر زبانیں اپنے ابتدائی دور میں دوسری زبانوں سے استفادہ کرتی رہی ہیں۔ گویا ترقی پذیر زبانیں ترقی یافتہ زبانوں کی انگلی پکڑ کر چلنا بلکہ دوڑنا سیکھتی ہیں اور یوں ترقی کی منازل طے کرتی جاتی ہیں۔ ترقی یافتہ زبانوں سے استفادے کا عمل ترجمے کے ذریعے ہی فروغ پاتا ہے۔ کیونکہ ترقی یافتہ زبانیں طویل تاریخ رکھتی ہیں اور ان زبانوں میں علمی ذخائر نسبتاً زیادہ موجود ہیں۔ ابواللیث صدیقی کے بقول ہیں:

"نوزائیدہ اور ترقی یافتہ دونوں زبانوں میں علمی و فلسفیانہ ابلاغ و اظہار میں ترجمے بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ترجموں ہی کی مدد سے کوئی زبان ابتدا میں گردوپیش کی زبانوں کا اثر و نفوذ قبول کرتی ہے۔"(۴)

انسان اپنی بقا کے کے لیے دوسرے ہم جنسوں کا محتاج ہے، اسی طرح کسی خطے کی زبان، اس سے وابستہ سماج اور اس سماج میں رائج علوم کی بقا کا انحصار ترجمہ کاری پر ہے۔ کیونکہ تراجم کے ذریعے ہی علوم ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہیں۔ ترجمہ کاری کے بغیر کوئی بھی زبان تنہا رہ جاتی ہے، جو نہ صرف اس زبان بلکہ اس زبان سے وابستہ سماج کے لیے بھی خطرے کی گھنٹی ہے۔ تراجم خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ اس ضرورت کے تحت اقوام عالم مختلف زبانوں کے متون ترجمے کے ذریعے اپنی زبانوں میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ مغلوں کے دور میں سرکاری زبان فارسی تھی، مختلف زبانوں سے معروف کتابوں کے فارسی میں تراجم کیے گئے، یہاں تک کہ مہابھارت کا بھی فارسی ترجمہ کرایا گیا جو ۱۵۹۱ء میں مکمل ہوا۔ بادشاہ اکبر نے سنسکرت سے شاعری، فلسفہ، ریاضی، الجبرا جیسے علوم پر مشتمل کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ بعد ازاں انگریز کی زیر نگرانی دلی کالج اور علی گڑھ کالج کے پلیٹ فارم سے بہت بڑی تعداد میں فارسی، عربی اور سنسکرت سے اردو میں تراجم کیے گئے۔ یہ تراجم مذہب، تصوف، شاعری، داستانیں اور فلسفے کی کتابوں کے تھے۔ خلیق انجم اپنے مضمون "ترجمے کا ارتقاء" میں لکھتے ہیں:

"یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو کا پہلا ترجمہ کون سا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شاہ میراں جی خدانما نے ابو الفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف "تمہیداتِ ہمدانی" کا عربی سے اردو میں جو ترجمہ کیا تھا وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔"(۵)

اردو میں فنِ ترجمہ کاری کی طرح ملا وجہی کی سب رس سے پڑی جو فتاحی نیشاپوری کی فارسی تصنیف "دستور العشاق"

کا اردو ترجمہ ہے۔ شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی تصنیف ''معرفت السلوک'' کا اردو ترجمہ کیا، جو ۱۷۰۴ء میں شائع ہوا۔ ترقی پذیر قومیں، ترقی یافتہ اقوام کی کوششوں سے استفادہ کرنے کے لیے، ان کے علوم وفنون کو تراجم کے ذریعے اپنی زبان میں منتقل کرتی ہیں اور اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہیں۔ یوں تراجم زبانوں کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تراجم ہی کی بدولت نئے الفاظ کے ساتھ نئے مضامین اور موضوعات اس زبان کا حصہ بنتے ہیں۔ تراجم سے کسی بھی زبان کے ابتدائی دور میں اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اردو ترجمے کی تاریخ میں ایک اہم نام دہلی کالج کا ہے۔ دہلی کالج وہ واحد کالج تھا جہاں ہیئت، فلسفہ، تاریخ، ریاضی اور موسیقی جیسے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ دہلی کالج میں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام ۱۸۴۱ء میں عمل میں آیا۔ دہلی کالج کے تراجم کے بارے میں میر حسن اپنے مضمون ''وضع اصطلاحات کے مسائل'' میں لکھتے ہیں:

> ''دہلی کالج کے مترجمین نے علم ہیئت، کیمسٹری، پولیٹکل سائنس، اکانومی، قانونِ مال، میکانیات، تاریخ عالم، جغرافیہ، طبیعات، مقناطیس، جراحی، حرکیات وسکونیات، علم المناظر، حرارت اور طب سے متعلق کوئی تیس کتابوں کا ترجمہ شائع کیا۔''(۶)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں انگریزی راج تیزی سے پھیلنے لگا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں حکمرانی کے لیے طویل مدتی منصوبے پر کام شروع کیا۔ جس کا پہلا مرحلہ مستقبل کے انگریز انتظامی افسران کی تربیت تھا۔ انگریز اس حقیقت سے کماحقہ آگاہ تھے کہ ان افسران کے لیے ہندوستان کے سماج اور تاریخ سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے انگریزوں نے فارسی اور ہندی کی بجائے اردو زبان کا انتخاب کیا اور فارسی، ہندی، سنسکرت، عربی میں لکھے گئے مقامی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے تراجم کا سلسلہ شروع کیا۔ اردو ترجمہ کاری کی روایت میں فورٹ ولیم کالج کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، تذکرے، افسانے، صرف ونحو، اخلاق، فقہ، اسلام، تاریخ، یہاں تک کہ قرآن اور انجیل کے ترجمے بھی شائع کیے گئے۔ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں (ترجمہ نگاروں) میں میر امن، بہادر علی حسینی، کاظم علی جوان، عبداللہ مسکین، مظہر علی، شیر علی افسوس اور حیدر بخش حیدری وغیرہ کے نام اہم اور قابل ذکر ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد ترجمہ نگاری میں حیدر آباد دکن ایک اہم مرکز بن کر ابھرا۔ جہاں نواب محمد فخر الدین خان (شمس الامراء) نے ہندوستانی طلبا کے لیے مغربی علوم وفنون کی کتابوں کے تراجم کرائے۔

اسی زمانے میں اودھ کے نواب محمد علی شاہ، سید کمال الدین حیدر سے مغرب کے جدید علوم کی کتابوں کا ترجمہ کروا رہے تھے جو مطبع سلطانی لکھنو سے شائع ہو رہی تھیں۔ مولوی کمال الدین نے رصد گاہ کے ناظم کرنل ولیکاک کی نگرانی میں تقریباً بارہ رسالوں کا ترجمہ کیا۔

اردو تراجم کی روایت میں سائنٹفک سوسائٹی اور سر سید احمد خان کا نام قابل ذکر ہے۔ اس ادارے کا سب سے بڑا کارنامہ اردو میں انگریزی کتابوں کے تراجم کو رواج دینا اور ایک نیا علمی اور عقلی انداز فکر پیدا کرنا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم کے حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروائیں۔''(۷)

سائنٹفک سوسائٹی کے بعد انجمن ترقی اردو کا نام قابل قدر ہے جس کی بنیاد ۱۹۰۳ء میں پڑی۔ ۱۹۲۰ء میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ مولوی عبدالحق کو دارالترجمہ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ دارالترجمہ کی خدمات کے

بارے میں ڈاکٹر امیر عارفی لکھتے ہیں:

"دارالترجمہ نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۸ء تک پورے اکتیس سال اپنی عظیم الشان روایت کو برقرار رکھا۔ ۱۹۵۰ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو کے بجائے انگریزی کو قرار دیا گیا تو دارالترجمہ داستان پارینہ بن گیا۔"(۸)

انجمن پنجاب نے مغربی علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اردو ترجمے کی روایت میں سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل سوندھی نے سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔

ترقی اردو بورڈ کراچی کا قیام ۱۹۵۸ء میں عمل میں آیا۔ اس ادارے نے فنِ ترجمہ نگاری کے فروغ کو اپنے مقاصد میں بطورِ خاص شامل کیا۔ ۱۹۶۲ء میں مرکزی اردو بورڈ لاہور قائم کیا گیا، جس کا مقصد سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانا ہے۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور کے بعد مقتدرہ قومی زبان پاکستان کا نام انتہائی اہم ہے۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں چند مترجمین نے اپنی انفرادی کوششوں کے ذریعے غیر ملکی ادب کے اردو ترجمے کیے۔

پاکستان قائم ہونے کے بعد ایسے بہت سے ادارے قائم ہوئے جن کے زیرِ اثر ترجمہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں انجمن ترقی اردو، سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان، کراچی نیشنل بک کونسل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، مغربی پاکستان اکیڈمی، اردو سائنس بورڈ، مجلس ترقی ادب، اکادمی ادبیات، مرکزی اردو بورڈ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد جیسے ادارے اہم ہیں۔

اردو ترجمہ نگاری کی روایت میں حمرا خلیق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی تصنیف "مشرق و مغرب کے افسانے" تراجم پر مشتمل کتاب ہے جسے اکادمی بازیافت کراچی نے جون ۲۰۱۱ء میں پہلی دفعہ شائع کیا۔ اس کتاب میں مشرق اور مغرب کے مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کے تراجم شامل کیے گئے ہیں۔ مذکورہ کتاب کے افسانے سہ ماہی رسالہ "ارتقاء" اور ماہنامہ "افکار" میں شائع ہوتے رہے۔ حمرا خلیق کے ان افسانوی تراجم کے حوالے سے معروف نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی رقم طراز ہیں:

"حمرا خلیق کے تراجم ایک طرف تو تراجم نہیں لگتے بلکہ وہ ان کی جگہ طبع زاد کہانیاں معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان کہانیوں کا اصل تحریروں سے مقابلہ کیا جائے۔۔۔۔۔ ان کہانیوں میں اصل ترجمے کی روح موجود ہے۔ تو میں حیرت انگیز طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ صرف اصل کہانیوں کی روح موجود ہے۔ بلکہ ان کہانیوں کے قارئین کی زبان کے ساتھ ساتھ علاقے کا ضمیر بھی شامل ہے۔"(۹)

ایک زبان کے محاورے سے دوسری زبان کے محاورے میں ترجمہ سب سے مشکل کام ہے اور حمرا خلیق کے تراجم کا مطالعہ کیا جائے تو حمرا اس کوشش میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ "مشرق و مغرب کے افسانے" کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے رقم کیا ہے۔ پیش لفظ حمرا خلیق نے قلم بند کیا ہے۔ اس کتاب میں سولہ افسانے ہیں جو موپساں، دھوم کیتو، ہماچاریہ، علاالدین آزاد، چترا بینر جی دیوا کرونی اور گیبریئل گارشیا مارکیز جیسے افسانہ نگاروں کی کہانیوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔

"مشرق و مغرب کے افسانے" میں شامل تمام کہانیاں انگریزی زبان سے اردو میں منتقل کی گئی ہیں۔ تاہم ان کہانیوں میں تراجم کے باوجود ارضی پہلو غالب ہے۔ ان کہانیوں کے کردار ہمارے سماج کی زندہ جاوید کردار معلوم ہوتے

ہیں۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے ایک طرف حمرا خلیق کے گہرے معاشرتی مشاہدے کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان کی تخلیقی صلاحتیں بھی نکھر کا سامنے آئیں ہیں جس سے تراجم میں طبع زاد کہانیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ تاہم انھوں نے تراجم کے اصولوں کو بھی پوری طرح برتا ہے اور اصل کہانی کی روح م کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ سید مظہر جمیل کی رائے میں:

> ''حمرا خلیق کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان کا لہجہ اور اسلوب اصل مصنف اور اس کی کہانی کے مزاج پر حاوی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتی اور اصل کو اصل کی طرح برقرار رکھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔''(۱۰)

حمرا خلیق اپنے تراجم کے حوالے سے خود لکھتی ہیں:

> '' میں نے اس کام کو فرض سمجھ کر اپنا لیا اور جو بھی کہانی کسی بھی ملک کے ادیب کی مجھے پسند آتی۔ میں اس کا ترجمہ کر لیتی لیکن آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ مجھے ہر ملک کی زبان آتی ہے۔ ظاہر ہے جن کہانیوں کا میں ترجمہ کرتی ہوں (خواہ وہ کسی ملک کی ہوں) انگریزی میں ہوتی ہیں۔''(۱۱)

اس مجموعے میں سولہ تراجم شامل ہیں، تین گیریل گا شامار کیز کے اور تین افسانے چترا دیو کرونی کے بھی شامل ہیں۔ افسانوی تراجم کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں کہانی پن کا عنصر مفقود نہ ہو۔ واقعات میں تسلسل برقرار رہے، کہانی آغاز، وسط اور انجام کی شرائط کو پورا کرے۔ حمرا خلیق ترجمہ نگاری کے ان معیارات سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار رومانوی اور تخیلاتی نہیں بلکہ وہ اپنے کردار افتادگان خاک سے تلاش کرتی ہیں ۔''مشرق و مغرب کے افسانے''کی کہانیوں میں ان خوبیوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

حمرا خلیق کے افسانوی تراجم پر مشتمل دوسری کتاب ''نمکین چائے اور باقر خانیاں'' کشمیری لوک کہانیوں پر مشتمل انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتاب ہے۔ کتاب کی پہلی اشاعت ۲۰۰۳ء میں مکمل ہوئی جب کہ ۲۰۱۷ء میں اس کتاب کے تراجم سمیت دیگر تراجم کو ''چار کتابیں'' کے عنوان سے ایک ہی کتاب میں شائع کیا گیا۔ ''نمکین چائے اور باقر خانیاں''میں بھی سولہ کہانیوں کے تراجم شامل ہیں۔ حمرا خلیق اس کتاب کی وجہ تخلیق ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

> ''کشمیری لوک کہانیوں کی کتاب مجھے اپنے بیٹے حارث کی کتابوں میں رکھی نظر آئی۔ میں نے یوں ہی ورق گردانی شروع کر دی۔ یہ کتاب انگریزی میں تھی۔ کہانیوں پر نظر ڈالتے ڈالتے مجھے خیال ہوا کہ اگر اس کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے تو ہمارے ملک کے بچے بچیاں بھی آسانی سے ان کہانیوں کو پڑھ سکیں۔''(۱۲)

اس مجموعے میں شامل ساری کہانیاں کشمیری کلچر، تہذیب و تمدن، رسم و رواج، کھانا پینا، پہننا، اوڑھنا انداز زندگی اور کو بیان کرتی ہیں۔ جیسا کہ درج بالا ذکر ہوا کہ حمرا خلیق کا اس کتاب کی تخلیق کا مقصد بھی کشمیری کلچر سے نئی نسل کو شناسا کروانا تھا اور وہ اس مقصد میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ حمرا خلیق کا کشمیری کلچر سے براہ راست تعلق تھا کیونکہ ان کے شوہر خلیق ابراہیم کا تعلق کشمیری خانوادے سے تھا۔ اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

> ''میں نے یہ بھی سوچا کہ اس کتاب کو اپنی پوتی مثال خلیق کے نام معنون کر دوں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ اس کے دادا خلیق ابراہیم خلیق کا تعلق کشمیری خانوادے سے ہے۔ ان کے آباؤ اجداد لگ بھگ دو سو سال پہلے کشمیر سے لکھنو آ کر بس گئے تھے۔''(۱۳)

''کشمیری لوک کہانیوں'' میں شامل تراجم میں مجموعی تاثیر، مرکزی خیال، تخیل، الفاظ کی نشست و برخاست،

بحری تناسب، صوتی آہنگ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ سلاست اور روانی کے اعتبار سے ان کہانیوں پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے، کہانی "عفریت" اس کی بہترین مثال ہے:

> "اوہ سنا ہے وہاں وہ خوفناک عفریت گھس آیا ہے۔ سنا ہے وہ خون خوار ہے۔ اس نے گاؤں کے اتنے سارے لوگوں کو مار دیا کہ لوگ ڈر سے گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔"(۱۴)

A Flight of Pigeons رسکن بانڈ کا ناول ہے جو ۱۹۴۰ء میں پہلی طبع ہوا اور اس کے بعد بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۸۱ سالہ انگریزی ادیب رسکن بانڈ ہندوستان میں بچوں کی کہانیاں لکھنے والے ادیبوں میں خاصے مقبول ہیں۔ گزشتہ چھ دہائیوں میں وہ ۵۰۰ سے زائد کہانیاں، ۱۵۰ ناول اور دوسری کتابیں لکھ چکے ہیں۔ رسکن بانڈ کے ناول A Flight of Pigeons کا ترجمہ کبوتروں کی پرواز کے نام سے حمرا خلیق نے ۲۰۰۷ء میں کیا۔ معروف ہدایت کار شیام بینگل نے "جنون" کے نام سے اس ناول پر فلم بھی بنائی جو عمدہ اداکاری، چابک دستی اور ہدایت کاری کی وجہ سے یادگار ہے۔ ہندوستان کی ساہتیہ اکادمی نے بچوں کے لیے اس ناول کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا۔ جس کے لیے سپیرا رائے نے خاکے بنائے۔ اس ناول کا مرکزی نقطہ جنگ ہے۔ جنگ جو ایک طرف جنون انگیز محبت کا سبب بنتی ہے تو دوسری طرف زندگی میں رکاوٹ، شوریدگی، بدامنی اور بغاوت جیسے تخریبی عناصر کو جنم دیتی ہے۔ شمالی ہندوستان بھی مسلسل جنگ و جدل کی وجہ سے ان عناصر کا شکار تھا۔ ۱۸۵۷ء میں میرٹھ چھاؤنی میں ہندوستانی سپاہیوں کی انگریز افسران کی حکم عدولی نے، اس تخریبی ماحول کو بغاوت کی ایسی لپیٹ میں لیا جس کے نقش اور اثرات آج بھی قومی تاریخ میں بہت گہرے ہیں۔

"سنجوگ" عبداللہ موریگ مرے کی کتاب "My Khyber Marriage" کا ترجمہ ہے۔ اس کی پہلی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۸ء میں ہوئی۔ اس کا انتساب حمرا خلیق نے اپنی ہونہار شاگردہ زاہدہ حنا جو کہ موجودہ دور کی ایک نامور کالم نگار اور مشہور و معروف افسانہ و ناول نگار ہیں کے نام کیا ہے۔ سنجوگ ناول کو شخصی یادوں پر مشتمل سوانح خاکہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ناول کے اسلوب کی روانی اور سلاست سے اس میں طبع زاد خصوصیات در آئی ہیں۔ اس ناول کا موضوع قبائلی نظام، معاشرے کے مظلوم طبقے اور عورت کی معاشرتی مفلوک الحالی ہے۔ قبائلی نظام میں عورت کو انتہائی گھٹیا مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ جس سے عورت احساس کمتری اور نفرت بھرے جذبات میں مبتلا ہو جاتی ہے تو دوسری طرف اس متعصب رویے سے گرہستی نظام بھی تباہ و برباد ہو جاتا ہے جس کے نئی نسل پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی صاحب نظر بے خبر ہو۔

"طالبان کے دیس سے فرار" حمرا خلیق کے تراجم پر مشتمل کتاب ہے جسے عکس پبلشرز نے ۲۰۱۹ء میں پہلی دفعہ شائع کیا۔ یہ ناول چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کا انتساب حمرا خلیق نے "تمام ستم رسیدہ اور نظر انداز شدہ درماندہ لوگوں کے نام" کیا ہے۔ یہ ناول کل ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سوانحی ناول بنگالی مصنفہ سشمیتا بندوپادھیائے نے لکھا جو سشمیتا بینرجی کے نام سے معروف تھیں۔ یہ ناول بنگالی میں کابلی والا رینگالو ئیو (کابلی والا کی بنگالی بیوی) کے نام سے شائع ہوا۔ اس نام میں ٹیگور کے مشہور ناول کابلی والا سے مناسبت بھی پیش نظر تھی۔ سشمیتا ۱۹۶۳ء بھارتی ریاست مغربی بنگال کے دار الحکومت کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ اسی کی دہائی میں وہ بنگال کے ایک تھیٹر سے وابستہ تھیں جہاں ان کی ملاقات ایک افغان شہری جانباز سے ہوئی۔ ۲ جولائی، ۱۹۸۸ء کو ان کی شادی ہو گئی۔ جانباز خان انھیں اپنے ساتھ افغانستان لے آیا جہاں سشمیتا کو معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔ ایک روز جانباز خان سشمیتا کو بتائے بغیر ہندوستان لوٹ آیا اور سشمیتا ایک اجنبی

ملک میں شوہر کے رشتے داروں کے پاس پھنس کر رہ گئیں۔ یہ ناول طالبان کے دیس سے فرار ان کے انہی ایام اور ان سے رہائی کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ افغانستان سے فرار کی انھوں نے دو کوششیں کیں۔ ایک مرتبہ وہ افغانستان سے پاکستان بھی آئیں مگر آگے ہندوستان نہ جا سکیں۔ سوانحی ناول میں پاکستان اور پاکستانیوں کی مدد کا احوال دیانت داری سے بیان کیا گیا ہے۔ بعد میں وہ افغانستان سے ہندوستان پہنچیں جہاں ۲۰۰۳ء میں اُن کے اسی ناول پر Escape from Taliban کے نام سے فلم بنائی گئی۔ اس فلم میں سشمیتا کا کردار بھارتی اداکارہ منیشا کوئرالہ نے ادا کیا۔ اس کے بعد انہوں نے افغانستان میں ہی اپنے تجربات پر چار مزید کتابیں لکھیں۔ سشمیتا افغانستان میں ڈسپنسری چلاتی تھیں۔ ایک سینئر پولیس افسر نے بی بی سی کو بتایا کہ بینر جی (سیدہ کاملہ) پکتیکا صوبے میں صحت کے شعبے سے وابستہ تھیں، پیشورانہ امور کے علاوہ وہ عورتوں کی زندگی کے واقعات قلم بند بھی کرتی تھیں۔ پولیس کے مطابق طالبان عسکریت پسند نے نیز جی کے گھر پر دھاوا بول کر، اہل خانہ کو رسیوں سے باندھ دیا گیا اور بینر جی کو قتل کر دیا گیا۔ تاہم اس حملے کی ذمہ داری کسی نے بھی قبول نہیں کی۔ ۴۹ سالہ بینر جی کا تعلق بھارت سے تھا اور وہ افغانستان میں اپنے شوہر جانباز خان مقیم تھیں۔ یہ ناول حقیقت نگاری کا ایک مرقع ہے جس میں بینر جی نے ایک طرح سے آپ بیتی بیان کی ہے۔

حمرا خلیق کے تراجم میں مہارت اور قدرت کے ساتھ کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایسے کردار تخلیق کرتی ہیں جن کو انھوں نے اپنی حقیقی زندگی میں بھی دیکھا ہو۔ حمرا خلیق نے اپنے تراجم میں زندگی کی تلخیوں اور ناہمواریوں کو رومانویت کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ حمرا خلیق نے جنسیات اور جذباتِ انسانی کی جس طرح تصویر کشی کی ہے وہ انشاپردازی کا خوبصورت نمونہ ہے۔ ان کے تراجم میں رومانویت کے علاوہ حقیقت کی آمیزش بھی موجود ہے۔

حمرا خلیق کے تراجم میں دیگر زبانوں کے ثقیل الفاظ استعمال نہیں ہوئے البتہ کہیں کہیں انگریزی کے چند الفاظ تراجم میں ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً سیکنڈ ہینڈ، بلڈوزر اور پلیٹ فارم جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ حمرا خلیق نے اپنے ترجموں میں بہت سلیقے اور فنی مہارت سے رموزِ اوقاف کا استعمال کیا ہے۔ اس سے ان کی علمی استعداد کا بھی علم ہوتا ہے اور ان کی اردو زبان سے وابستگی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے گرائمر کے لحاظ سے ہر نکتے کو عمدگی سے برتنے کی کوشش کی ہے اور اس کاوش میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔

حمرا خلیق نے جذب و قبول کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اپنی ترجمہ کاری سے زبان میں نئے خیالات داخل کیے ہیں۔ ان کے ہاں جدید خیالات کے ساتھ ساتھ نئی تشبیہات اور تازہ استعارے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے زبان کو نئی جہت اور وسعت حاصل ہوئی۔ اپنے تراجم کے ذریعے انھوں نے نئے خیالات اور نئی اصنافِ ادب کو فروغ دینے کے ساتھ ذاتی افکار اور خیالات سے بھی قارئین کو آشنا کیا ہے۔ فنی اعتبار سے بھلے ہی ترجمے کو طبع زاد کے مقابلے میں کمتر سمجھا جائے لیکن اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ ہمارے ہاں جدید نثری اصناف ناول، افسانہ، خاکہ، انشائیہ، مکتوب، رپورتاژ نظم میں آزاد نظم، ترائیلے، ہائیکو مثلث و دیگر اصناف سخن ترجمے ہی کے ذریعے متعارف ہوئی ہیں۔ عالمی سطح پر علمی و ادبی دوڑ میں شامل رہنے کے لیے ترجمہ دور جدید کی بنیادی ضرورت ہے۔ دورِ جدید میں جب دنیا گلوبل ولیج ہے اس امر کی ضرورت مزید اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ دنیا کے جتنے بھی علوم ہیں ان کی بنیادی وجہ ترجمہ ہے۔ گویا ترجمہ کے ذریعے نہ صرف علوم قریب آتے ہیں بلکہ تہذیب و ثقافت بھی دوسری قوموں میں منتقل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیر کی یہ رائے ہے:

> "ترجمہ محض لسانی عمل نہیں ہے۔ اسے تخلیقی اور ثقافتی عمل بھی کہا جانا چاہیے۔ ترجمے کے ذریعے صرف ایک زبان، دوسری زبان میں اپنے متبادلات و مترادفات تلاش نہیں کرتی، بلکہ دو ثقافتیں ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتی ہیں۔ نیز ایک دوسرے کے عقلی اور تخیلی منطقوں سے آشنا ہوتی ہیں۔"(۱۵)

ترجمہ نہ صرف دو زبانوں میں بلکہ دو تہذیبوں میں ایسا پل ہے جو خیالات و تصورات کی منتقلی کا سبب بنتا ہے۔ ایک زبان کے علمی و ادبی سرمائے کی دوسری زبان میں منتقلی تراجم ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم اور ربط ضبط کی راہیں بھی تراجم ہی کے ذریعے کھلتی ہیں۔ علم کی وسعت اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ تراجم ہی کی بدولت دنیا کے مفکروں، دانش وروں، شاعروں کی فکر ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتی ہے۔ شیکسپیئر، ارسطو، افلاطون، نطشے، ہیگل، کافٹ بادیر، دوستوفسکی، ٹیگور، فردوسی، سعدی، مولانا روم اور دیگر اقوام کے عالی دماغ کی تخلیقات ترجمے کے سبب ہم جانتے ہیں۔ تراجم کے بغیر کوئی کام بھی نہیں چل سکتا اگر یہ فن نہ ہوتا تو یقیناً آج ہمارا علم محدود ہوتا۔

حمرا خلیق نے تراجم کی اسی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے تراجم میں سادگی، عام فہم انداز، خلوص، واقعات نگاری، سنجیدگی، جزئیات نگاری، دلکشی اور محققانہ انداز جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ حمرا خلیق کے ترجمے بے شک بہت کم ہیں لیکن ان کا شمار اعلیٰ اور اچھے ترجموں میں ہوتا ہے۔ ان کے تراجم کی اہمیت وافادیت محمد علی صدیقی کے ان الفاظ سے واضح ہے:

> ”میں نے حمرا خلیق کے تراجم کا بالا ستعیاب مطالعہ کیا ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ حمرا خلیق کم از کم ان افسانوں میں شاید اصل مصنفین کی ہمزاد ہونے کی شرط پر پوری اتری ہیں۔ اور ان کے افسانوں کو اُردو کے لسانی Ethos میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو پائی ہیں یہ ان افسانوں کی محض اردو زبان میں منتقلی سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ان کے تراجم ترجمانی بھی نہیں جسے آج کے سہل نگار مترجمین نے اپنی سہل نگاری کو خوبصورت بنانے میں اپنے لیے عملاً رواج دیا ہے۔“(۱۶)

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) مرزا حامد بیگ، مغرب کے نثری تراجم، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء)، ۱۵۔
(۲) مرزا حامد بیگ، اردو میں ترجمے کی روایت، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۴ء)، ۶۹۔
(۳) ڈاکٹر رشید امجد، ترجمے کا فن، مشمولہ رویے اور شناختیں، (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۸ء)، ۲۱۔
(۴) ابو اللیث صدیقی، تجربے اور رویے، (دہلی: غالب اکیڈمی)، ۶۴۔
(۵) خلیق انجم، اردو ترجمے کا ارتقا، مشمولہ فن ترجمہ کاری، (اسلام آباد: طاہر پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۲ء)، ۸۴۔
(۶) میر حسن، وضع اصطلاحات کے مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۴ء)، ۱۴۱۔
(۷) مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۶ء)، ۳۶۔
(۸) ڈاکٹر امیر عارفی، دارالترجمہ عثمانیہ، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۴ء)،
(۹) ڈاکٹر محمد علی صدیقی، حمرا خلیق کی ترجمہ کاری مشمولہ چار کتابیں، (کراچی: اشارات پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۶۱۔
(۱۰) سید مظہر جمیل، ”مشرق و مغرب کے افسانے“ مشمولہ ایضاً، ۷۸۔
(۱۱) حمرا خلیق، مشرق و مغرب کے افسانے، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۱ء)، ۳۱۔
(۱۲) حمرا خلیق، مشرق و مغرب کے افسانے، ۸۰۔
(۱۳) ایضاً، ۵۲۔
(۱۴) ایضاً، ۵۰۔
(۱۵) ڈاکٹر ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء)، ۴۰۔
(۱۶) ڈاکٹر محمد علی صدیقی، حمرا خلیق کی ترجمہ کاری مشمولہ چار کتابیں، ۲۹۔

❖❖❖